عہدِ نبوّت کے عمرانی اور تمدّنی مسائل

(حکیم حبیب الرحمان صاحب صدیقی)

عقل و شعور اور دلِ دردمند رکھنے والے ہر انسان کی نگاہِ تجسس ایک ایسی نئی دنیا کی تعمیر کے لئے وقفِ انتظار ہے جس کی ہر صبح مسرت بدوش اور حیات آفریں ہو اور ہر شام سکون بخش اور گہوارۂ راحت ہو۔ وہ کون ہوگا جو ایسی انسانی سوسائٹی کی ضرورت نہ محسوس کرتا ہوگا جس کا ہر فرد خدا ترس، خود آگاہ اور فرض شناس ہو، جس کے حدودِ مملکت میں ہر انسان زندگی کی حقیقی لذتوں سے لطف اندوز ہو، جہاں ایک دل بھی بالادست انسانوں کی چیرہ دستیوں سے اندوہگیں نہ ہو اور نہ کوئی آنکھ زندگی کی محبوب اور حسین تمناؤں کی پامالی سے نمناک ہو۔ بلاشبہ ایک سنجیدہ فکر اور با احساس انسان کے لئے از حد مشکل ہے کہ وہ محنت کش اور دکھیا انسانوں کی چیخ پکار، اخلاق و شرافت کی رسوائی، متاعِ انسانیت کی پامالی اور انسانی خون کی ارزانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس پر خون کے آنسو نہ بہائے لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے کہ اس بے نور اور بے ذوق دورِ انسانیت میں درندہ صفت جاہ پرستوں کی کوئی کمی نہیں مگر ایسے بالغ النظر لوگ بہت کمیاب ہیں جو زمانہ کی رفتارِ نبض کو پہچان کر بیمار دنیا کے لئے نسخۂ شفا مہیا کر سکیں، ورنہ مبدأ فیض کے دارالشفا میں ہر درد کا علاج موجود ہے اور سازِ فطرت میں نغمہ ہائے زندگی کی کوئی کمی نہیں ہے

تو رہ شناس نئی و ز مقام بے خبری   چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمی نیست

دورِ حاضر کا انسانی دماغ جن عملی مسائل سے الجھا ہوا ہے وہ ہمارے ہی زمانہ کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ وہ ہمیشہ سے انسانی فکر و توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہر دوسرے دور میں پہلے دور کی نسبت سے ان مسائل کی سطحی نوعیت و ضعیت بدلتی رہتی ہو۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ بدلتی رہی ہے لیکن زندگی کے واقعی اور حقیقی مطالبات ہر زمانہ میں ایک جیسے رہے ہیں اور اس لئے زندگی سے تعلق رکھنے والے عملی مسائل بھی بنیادی طور پر یکساں ہی رہے ہیں۔ اس بنا پر عقل و بصیرت اور دیانت و انصاف کا اقتضاء یہ ہے کہ مسائلِ حاضرہ کے عملی حل کے لئے

انسانی تاریخ کا تحقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کیا ماضی کے کسی دور میں ان مسائل کا مؤثر عملی حل پیش کیا گیا ہے اور کیا کسی انقلابی تصورحیات کے ذریعہ ایسی پاکیزہ انسانی سوسائٹی کی تشکیل عمل میں آئی ہے جس کا ذکر پچھلی سطور میں کیا گیا ہے؟ اگر کسی انسانی دور میں ایسا ہوا ہے تو ہماری انتہائی بدنصیبی ہوگی کہ ہم اس مقدس انقلاب کے بانی کی پاکیزہ زندگی کی رہنمائی قبول کرنے کے بجائے کسی ایسے شخص کی رہنمائی قبول کریں جو راہ و رسم منزل سے ناآشنا ہے۔ یقیناً آج انسانی دنیا کی آفاق گیر تباہی و بدامنی اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ آج انسانوں کی زمام کار ان ائمۂ ضلالت کے ہاتھ میں ہے۔ جو اُن کو خدا اور اُس کے پیغمبروں کی راہ سے پھیر کر فساد و معصیت کی راہ پر چلا رہے ہیں ؎ لا یصلح الناس فوضی لاسراۃ لہم ولا سراۃ اذا جہالہم سادوا

یہ مقدس انقلاب جو چھٹی صدی میں ظہور پذیر ہوا پوری انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا انقلاب تھا۔ جس کی تہ میں عالمگیر اور بین الانسانی تصورحیات کارفرما تھا۔ اور جس نے انسانوں کا زاویۂ نگاہ زندگی کا نقطہ نظر اور فکر و نظر کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ یہاں تک کہ کرۂ ارضی پر بسنے والا کوئی انسان ایسا نہ رہ گیا تھا جو اس حیرت انگیز انقلاب سے متأثر نہ ہوا ہو۔

زیر نظر مقالہ میں یہ دیکھنا ہے کہ دنیائے انسانیت کے امیر اعظم حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کار نبوت کا آغاز کیا تھا تو اس وقت آپ کو کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اور آپ نے ان مسائل کو حل کرنے کے لئے کونسا طریق کار اختیار فرمایا تھا۔ نیز یہ کہ وہ مسائل اس زمانے کے وقتی مسائل تھے یا ان میں اور زمانۂ حال کے مسائل میں کوئی بنیادی فرق نہیں رہے؟ اگر دوسری صورت ہے یعنی عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل جن کو ارباب فکر و دانش کی بہیم اور لگاتار کاوشیں آج تک حل کرنے سے قاصر رہی ہیں، بنیادی حیثیت سے متذکرہ بالا دورِ انقلاب کے انسانی مسائل سے مختلف نہیں ہیں، تو اس صورت میں آج بھی وہی ہمہ گیر تصورحیات اور اسی طرز کی عملی جدوجہد انسانی دنیا کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کر سکتی ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں ایک مقدس اور پاکیزہ انسانی سوسائٹی معرض وجود میں آسکتی ہے۔

زمانہ قبل نبوت کے اجتماعی مفاسد جس انسانی دور میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز کیا۔ اگر اس کا موازنہ موجودہ دور سے کیا جائے تو ان میں اس لحاظ سے یقیناً اختلاف پایا جاتا ہے کہ

موجودہ دور علم و تہذیب کے اعتبار سے بہت آگے جا چکا ہے۔ اور انسانی تمدن کی ارتقائی حرکت اور علوم سائنس کی حیرت انگیز وسعت و ترقی نے انسان کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ اور جس تاریخی دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ وہ تاریک خیالی، وہم پرستی، جہالت اور علمی کم مایگی کا بدترین دور تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر مسائل زندگی کے الجھاؤ کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی واضح اور حقیقی فرق نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہاں علم و ہنر کا فقدان انسانیت کے لئے بلائے بے درماں تھا۔ اور یہاں حکمت و دانش کا غلط استعمال اہلِ دنیا کے لئے وجہ ہلاکت بن گیا ہے ؎

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

بہر حال سطور ذیل میں قبل از نبوت دور کے اُن بنیادی مفاسد کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس وقت انسانی دنیا کو ہلاکت و بربادی کی طرف دھکیل رہے تھے اور بظاہر ان کی اصلاح کی کوئی امید نہ تھی۔

بے روح اور غلط کارانہ مذہب پرستی | مذہب انسانی اجتماعیت کا قدیم ترین اور مؤثر ترین عنصر ہے اور اگر وہ الہامی صداقتوں اور ہمہ گیر اصولِ انسانیت پر مبنی ہو تو اپنے ماننے والوں میں خدا ترسی، حق پرستی اور ذکر و فکر کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ نیز شرفِ آدمیت کی نگہداشت اور حقوقِ انسانی کے تحفظ کا ضامن ہے۔ ایک سچا مذہب ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ اس کے ماننے والا خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے لئے انسانی آبادیوں کو پامال کرنے اور بے گناہ انسانوں کی لاشوں پر اپنا تختِ جبروت بچھائے۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر روح فرسا اور اندوہناک ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ اہلِ مذاہب نے مذہب کی حقیقی روح کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دی ہو۔ ورنہ آج تک جو کچھ دیکھا اور سنا گیا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمیشہ مذہب کے نام سے دنیا کے سٹیج پر بہیمیت ناک خونی ڈرامے کھیلے گئے اور مذہب کے پردہ میں ظلم پرور اہلِ مذاہب جس قدر وحشیانہ تمرد کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں اس سے شیطان کی روح بھی لرز جاتی رہی ہوگی۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے بالکل حقیقت پر مبنی ہے اور سوائے چند مستثنیات کے مذہب کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے۔ لیکن جس انسانی دور میں دنیا کے آخری ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ دعوت کیا وہ

اس حیثیت سے بدترین دورِ انسانیت تھا یعنی اُس دور میں مختلف مذاہب کو ماننے والے لوگ جس طرح مذہب کی توہین و تذلیل کر رہے تھے اُس کی مثال شاید انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے وقت دنیا میں یہودیت، مسیحیت، مجوسیت، حنیفیت، ہندو ازم، بدھ ازم وغیرہ مذاہب کو ماننے والے لوگ بکثرت موجود تھے۔ لیکن بے لوث خدا پرستی اور حقیقت شناسی کسی مذہب میں موجود نہ تھی۔ ہر مذہب چند رسوم و ظواہر کا مجموعہ رہ گیا تھا جو مختلف گروہ بندیوں کے لئے محض لیبل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہر مذہبی گروہ اپنی غلط کارانہ روش کو عین صواب سمجھتا تھا اور دوسروں کی اچھی چیز بھی اُس کی نگاہ میں بُری تھی گویا اُن کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف یہ رہ گیا تھا کہ جو چیز اُن کی طرف منسوب تھی وہ حق اور جو دوسروں میں پائی جاتی تھی وہ باطل تھی۔ اس غلط بینی اور اعتقادی گمراہی کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ مختلف گروہ بندیوں میں کوئی اصولی، اعتقادی اور عملی چیز وجہ اشتراک نہ رہی تھی بلکہ ہر گروہ دوسرے گروہ سے بالکلیہ مغایرت رکھتا تھا اور اسی چیز نے اُن گروہ بندیوں میں شدید نفرت اور عصبیت پیدا کر دی تھی۔

قَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ (بقرہ)	یہود نے کہا نصرانی کسی مذہب حق پر نہیں ہیں اور نصرانیوں نے کہا یہود حق پر نہیں ہیں حالانکہ یہ دونوں گروہ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔

یہ نفرت و عصبیت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ سے ناروا سلوک کرنے میں کوئی قباحت نہیں تصور کرتے تھے۔ دوسروں پر ظلم و تشدد کرتے۔ اُن سے بددیانتی کرتے۔ بلکہ اُن کے مقابلہ میں ہر بد اخلاقی کو روا سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہود کے غلط خیال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (الآیہ)	امیین (غیر اہل کتاب) کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس زمانہ کے اخلاقی تسفل و انحطاط کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مذہب کی عالمگیر سچائیوں پر علی وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں اور جن کی نگاہ حقیقت شناس نیکی کو ہر حال میں نیکی اور برائی کو ہر حال

میں بُرائی تصور کرتی ہے خواہ نیکی اور برائی کا تعلق اپنوں سے ہو یا بیگانوں سے! لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانہ کے اہلِ مذاہب، مذہب کی اس سیدھی سادی حقیقت سے بھی آشنا نہ تھے۔

دین و مذہب کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ انسانی قلب و نظر کو ذوقِ تجسس اور امتیازِ حق و باطل کی گہری بصیرت عطا کرتا ہے اور انسانی قوائے فکر و عمل کو معین حدود اخلاق کے زیرِ اثر نشو و نما دیتا ہے۔ اس لئے جو لوگ مذہب کی حقیقت سے آگاہ ہیں اُن کی دُوررس نگاہ کفر و معصیت کے ہر چہار سُو چھائے ہوئے دھندلکے میں بھی حق و صداقت کی متلاشی رہتی ہے اور زندگی کی تگ و دو میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی طلب و جستجو اور ذوقِ حق پرستی میں کسی قسم کی کمی نہیں واقع ہوتی بلکہ ان کا جذبۂ شوق بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ لیکن جس قوم میں خدا پرستی کی حقیقی رُوح فنا ہو جاتی ہے اس کی آنکھوں سے ایمان و عمل کے حیات آفریں حقائق اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے مذہب کی سطحی اور ثانوی درجہ کی باتوں پر ہی قناعت کر لیتی ہے یا دینِ آبائی کے اوہامِ باطلہ کو حقیقت تصور کر لیتی ہے۔

إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ	ان لوگوں نے اللہ کے مقابلہ میں شیطانوں کو اپنا دوست
مِن دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ	بنا رکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ وہ راہ راست پر چل
(الاعراف - ۳۰)	رہے ہیں۔

یعنی جیسے صرف مذہبی مراسم جن پر عمل کرنے سے کچھ دینا اور کھونا نہ پڑتا ہو ان کی اہمیت کو ضرورت سے زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ احکام دینی جن میں قربانی جان و مال اور ترک عیش و نشاط کا مطالبہ ہو ان کو اس طرح پس پشت ڈال دیا جاتا ہے گویا اب ان احکام کی ضرورت ہی نہیں یا وہ بالکل منسوخ ہو چکے ہیں یا خدائی دین کے مقابلہ میں بالکل ایک نیا دین تراش لیا جاتا ہے اور پھر اسی کو خدائی دین کا نام دے دیا جاتا ہے یہی وہ اعتقادی و عملی گمراہی ہے جو ہر زمانہ میں قوموں کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنتی رہی ہے۔

مرشدِ رومی حکیمِ پاک زاد — سرِ مرگِ امتاں بر ما کشاد

ہر ہلاکِ امتِ پیشیں کہ بود — زانکہ بر جندل گماں بردند عود

دورِ نبوت کے یہود و نصاریٰ کی بالکل یہی حالت تھی کہ ان کو دین کی زندہ اور متحرک روح سے کوئی

سروکار نہ تھا بلکہ انہوں نے دین کو خواہشاتِ نفس کا تابع بنا رکھا تھا۔ جہاں مذہب کا فیصلہ ان کی خواہشات کے خلاف ہوتا وہ کمال دیدہ دلیری سے احکامِ مذہب کی قطع و برید کر کے ان کو خواہشِ نفس کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ یُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (الآیہ)

ان میں تیکر سادہ یارا صواب و ناصواب کی تمیز ہی باقی نہ رہی تھی، علماء و مشائخ ان کو جس راہ پر ڈال دیتے یہ لوگ اسی راہ پر چل پڑتے تھے۔

اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ۔ (الآیہ)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا رب بنا رکھا ہے۔

یہود صرف اس بات کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے کہ وہ اسرائیلی یا یہودی النسل ہیں اور نصرانی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت مسیح کی الوہیت کو مان لینا ہی فلاح و نجات کے لئے کافی ہے لیکن ان کی عملی زندگی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہ آسکتا تھا کہ وہ فی الواقع کسی پیغمبر کی رہنمائی کو مانتے اور اللہ کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کی اس گمراہی کا بار بار ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کچھ یہودیوں اور مسلمانوں میں بات چل نکلی، یہودیوں نے دعویٰ کیا کہ "ہمارا مذہب سچا ہے اور نجاتِ اُخروی کا استحقاق بغیر ہمارے کسی کو نہیں ہے"۔ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں نے کہا "ہمارے نبی سب سے آخری نبی ہیں اور ہمارا دین آخری اور مکمل دین ہے"۔ لیکن ذیل کی قرآنی آیت میں ان لوگوں سے واشگاف الفاظ میں کہا گیا کہ محض دین و مذہب کی نمائش سے کچھ نہیں بنے گا، اصل چیز ایمان و عمل ہے، اگر یہ نہیں تو محض کسی مذہب کا قائل و پیرو ہونا تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔[1]

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَن يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ

نہ تمہاری آرزوئیں اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوئیں کام آئیں گی، (خدا کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ) جو شخص برائی کریگا اس کو اس کی سزا ملے گی اور نہیں پائے گا وہ اللہ کے سوا کوئی دوست اور نہ مددگار، اور جو نیک کام کریگا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو تو وہ جنت میں

[1] ابن جریر،

نَقِيرًا ۔ (النساء)

داخل ہوگا، اور اس پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

یہود کی عملی حالت کا نقشہ جو قرآنِ حکیم نے کھینچا ہے اس سے ان کی اخلاقی پستی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۔ (المائدہ)

آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ گناہ و سرکشی اور حرام خوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، بہت ہی برے ہیں وہ اعمال جو وہ کرتے ہیں، ان کے علماء اور مشائخ ان کو گناہ و معصیت کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے! بہت ہی برا ہے وہ کام جو وہ کرتے ہیں۔

اور عام اہلِ کتاب سے قرآنِ حکیم نے یوں خطاب کیا ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ (مائدہ)

اے پیغمبر! آپ کہدیں: اے علمبردارانِ کتاب! تم کسی صداقت پر نہیں ہو جب تک کہ تم توراۃ و انجیل اور ان احکام کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر اتارے گئے ہیں پوری طرح قائم نہ کرو۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۔ (النساء)

اے اہلِ کتاب تم اپنے دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ کی ذات پر حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔

مدینہ منورہ اور اس کے اردگرد یہود کثرت سے آباد تھے۔ یہ لوگ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس کے زمانہ میں مدینہ میں آ رہے تھے[1]۔ مدینہ منورہ کے علاوہ یہ لوگ خیبر، فدک، وادی القریٰ میں بھی آباد تھے۔ نیز عرب سے باہر یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں بھی پائے جاتے تھے لیکن ان کی کوئی جداگانہ ریاست دنیا کے کسی حصہ میں موجود نہ تھی۔ عرب میں ان کا ذریعۂ معاش تجارت، کھیتی باڑی اور سودی کاروبار تھا۔ یہ لوگ حد درجہ کے لالچی اور سنگدل تھے۔ بڑی بڑی شرحوں پر سودی رقمیں دیتے تھے اور کفالت کے طور پر لوگوں کے بچے بلکہ مستورات تک کو اپنے پاس رہن رکھتے تھے۔ ان میں دولت کی کثرت تھی۔ اس وجہ سے ان میں زنا و فحاشی کی کوئی حد نہ تھی اور علماءِ یہود نے اپنے امراء کی دلجوئی

[1] طبری۔

سکے لئے زنا کی سزا (جو تورات نے مقرر کی تھی) ہی بدل ڈالی تھی۔

مسیحی مذہب کے پیرو عرب میں بکثرت موجود تھے۔ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ قبائل ربیعہ و غسان عیسائی تھے، قضاعہ میں بھی عیسائیت کا اثر پایا جاتا تھا بلکہ مکہ معظمہ میں بھی کچھ پیروان مسیحیت پائے جاتے تھے۔ چنانچہ ورقہ بن نوفل جو ایک خداشناس عیسائی اور عبرانی زبان کے ماہر تھے، مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے۔

عیسائیوں میں اگرچہ کچھ بچے کھچے ایسے لوگ بھی تھے جو دل میں اللہ کا خوف رکھتے تھے اور ٹھیک ٹھیک مسیحی مذہب پر عمل پیرا تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی قرآن حکیم نے بھی تعریف کی ہے اور ایک مستند حدیث میں "الا بقایا من اہل الکتاب" کے الفاظ سے ان کو اس وقت کی گمراہ قوموں سے الگ کیا گیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ان کی عظیم اکثریت سخت گمراہی میں مبتلا تھی۔ چنانچہ ایک مسیحی مصنف ڈریپر لکھتا ہے:-

"عیسائیوں کے عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھل گیا تھا[1]"

اس زمانہ میں ایک گروہ مریمی کے نام سے پیدا ہوا تھا جو حضرت مریمؑ کو بھی شریک الوہیت تصور کرتا اور اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا۔ نیز اس زمانہ میں مسیحی فرقوں کے دلچسپ مسائل جن پر وہ پوری قوت صرف کر رہے تھے یہ تھے کہ حضرت مسیحؑ میں صرف خدائی طبیعت پائی جاتی ہے یا خدائی اور انسانی دونوں طبیعتیں ان میں جمع ہیں؟ اگر دونوں ہیں تو ان کا منشا ایک ہے یا الگ الگ!

نصرانیوں کی اخلاقی حالت یہود سے کچھ کم افسوسناک نہ تھی۔ زمانہ نبوت سے پہلے یہ لوگ دنیا کے بہت بڑے حصہ پر حکمران تھے اور دولت و اقتدار نے ان میں خطرناک حد تک ذمائم اخلاق پیدا کر دیئے تھے۔ زنا، مے نوشی، رشوت خوری، اور دیگر اخلاقی بیماریاں ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھیں۔ حضرت اقبال نے دور حاضر کے فرنگیوں کی زہر آلود معاشرت پر بڑی خوبی سے طنز کیا ہے ؎

فرنگیوں کو عطا خاک سوریا نے کیا　　نبی عفت و غمخواری و کم آزاری

[1] معرکہ مذہب و سائنس ص۳۲

حلہ فرنگ سے آیا ہے سوئے بازار مئے دقمار و ہجومِ زنانِ بازاری

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عہد رسالت کے ابتدائی دور میں عیسائیوں کی اخلاقی حالت کسی لحاظ سے انیسویں اور بیسویں صدی کی عیسائیت سے بہتر نہ تھی۔

مجوسیت کا سرچشمہ ایران کی سرزمین تھی لیکن عرب میں بھی کہیں کہیں اس کے اثرات پائے جاتے تھے۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ عرب کا قبیلہ تمیم مجوسی تھا اور اس دور کے مجوسیوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت ہمعصر اقوام سے کہیں زیادہ دردناک تھی۔ زمانہ بعثت نبوی سے بہت پہلے ایران کے مشہور رہنما مانی نے عیسائیت و مجوسیت کے اجزاء سے عجیب و غریب معجون تیار کیا تھا۔ ایک طرف اس کی جدت نوازی کا یہ حال کہ بیٹی اور بہن کی حرمت اٹھا دی تھی چنانچہ ایران کے ایک حکمران یزدگرد ثانی نے جو اس شریعت کا پیرو تھا اپنی بیٹی سے نکاح کیا اور کچھ مدت بعد اس کو قتل کر دیا۱؎۔

اس کے بعد ایک اشتراکیت پسند مزدک نامی مصلح پیدا ہوا جس نے یہ تعلیم دی کہ دولت اور عورت کسی کی ملکیت نہیں۔ اس دین کی اشاعت میں عیاش حکام و امراء نے سرگرم حصہ لیا کیونکہ یہ نیا دین ان کی تعیش پسندانہ طبائع سے مناسبت رکھتا تھا۔

قریش کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ کعبۃ اللہ کے نگہبان اور ملت ابراہیمی کے پیرو ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ یہود و نصاریٰ کے دعووں سے زیادہ بے حقیقت اور بے مغز تھا۔ ملت ابراہیمی کا بنیادی عقیدہ توحید ہے لیکن ان لوگوں کی زندگی کے کسی ایک گوشے میں بھی توحید کا شائبہ تک موجود نہ تھا بلکہ وہ شدید درجہ کی توہم پرستی اور شرک و بدعت میں مبتلا تھے اور ان کے معبودان باطل کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہاں بہت قلیل تعداد میں کچھ ایسے اشخاص بھی ان میں موجود تھے جن کے ضمیر بالکل مردہ نہیں ہو چکے تھے اور وہ اپنی خداداد بصیرت سے اس حقیقت کو جان گئے تھے کہ انسان کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے گھڑے ہوئے معبودوں کے سامنے سر نیاز خم کرے۔ چنانچہ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی بت کے سالانہ میلے میں ورقہ بن نوفل، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے۔ ان لوگوں نے یک لخت ہی محسوس کیا کہ یہ کیا حماقت ہے کہ ہم انسان ہو کر پتھروں کے سامنے جھکتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ان لوگوں نے حق و صداقت

۱؎ مورخین کی تاریخ عالم ص۲۹۱ بواسطہ سیرت نبوی جلد ۴

کی جستجو شروع کر دی۔ ورقہ، عثمان اور عبیداللہ نے مسیحی مذہب قبول کر لیا اور زید نے دینِ حنیفی کی تلاش میں شام کا سفر کیا، کئی پادریوں اور راہبوں سے ملے، لیکن جس چیز کی ان کو تلاش تھی اس کا سراغ نہ ملا اور بالآخر اسی اجمالی ایمان کو کافی سمجھا کہ "میں ابراہیم کا دین قبول کرتا ہوں"۔ اسی طرح امیہ بن صلت جو طائف کے رئیس اور مشہور شاعر تھے، نے بھی بت پرستی کی مذمت کی تھی۔ غالباً یہ وہی امیہ ہیں جن کی نسبت آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا "اس کا دل مومن اور دماغ کافر تھا"۔

دورِ جاہلیت کے کچھ سنجیدہ فکر اور صحیح الخیال اہلِ سخن کا کلام عربی لٹریچر میں ملتا ہے۔ نابغہ اور زہیر ان میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، چنانچہ نابغہ کے اس شعر سے اُن کی توحید پرستی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حَلَفْتُ فَلَمْ اَتْرُكْ لِنَفْسِكَ رِيْبَةً   وَلَيْسَ وَرَاءَ اللّٰهِ لِلْمَرْءِ مَذْهَبُ[1]

اور زہیر کے اس شعر سے ان کی وسعتِ نظر اور دقیقہ سنجی کا پتہ چلتا ہے:۔

وَاِنَّ الْحَقَّ مَقْطَعُهُ ثَلٰثٌ   يَمِيْنٌ اَوْ نِفَارٌ اَوْ جِلَاءٌ

ان کے علاوہ ایک جاہلی شاعر کا یہ مشہور شعر ہماری درسی کتابوں میں پایا جاتا ہے:

اَرَبًّا وَاحِدًا اَمْ اَلْفَ رَبٍّ   اَدِيْنُ اِذَا تَقَسَّمَتِ الْاُمُوْرُ

غرض سخنِ عشق کی آواز جاہلیت کے بے نور اور گھناؤنے دور میں بھی کہیں کہیں اُٹھ رہی تھی مگر اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے موجودہ مادہ پرستانہ ماحول میں صدائے حق کی ہے۔ اور عربوں کا عام مذاق ذوقِ خدا پرستی سے قطعی ناآشنا تھا۔

مدینہ منورہ کے مشرک قبائل اوس و خزرج کی دینی حالت بھی یہی تھی۔ یہ لوگ صدیوں پہلے جنوبی عرب زمین سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ سیل العرم کے زمانہ میں جو لوگ اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے اوس و خزرج بھی انہیں میں سے تھے۔ انہوں نے مدینہ منورہ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ اور یہود سے عہد و پیمان کر لیا تھا[2]۔

بعثتِ نبوی کے وقت ہندوستان کے ہندو اپنی تاریخ کے تاریک دور میں داخل ہو چکے تھے ربانی صحف پر

---

[1] اغانی تذکرہ نابغہ جلد ۹ ۔ [2] ابن کثیر ص ۲۲۲ ۔